بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(قارئینِ ترجمان اس سے واقف ہیں کہ جناب پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب ایک مدتِ مدید سے ترجمان القرآن کے اشارات سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ بلا مبالغہ وہ اس گرانبار اور نازک ذمہ داری کے ہر طرح اہل ہیں اور امرِ واقعی یہ ہے کہ وہ اس خدمت کو اپنے دیگر کثیر علمی مشاغل کے ساتھ بحسن و بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن وہ کچھ اچھی صحت کے مالک نہیں ہیں اور قارئین کرام کو یہ معلوم کر کے افسوس ہو گا کہ جولائی کے اوائل میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ کئی روز تک اپنے گھر (گوجرانوالہ) میں صاحبِ فراش رہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ مخلص و مشفق معالجین کے علاج سے ان کی طبیعت سنبھل گئی ہے اور اب چند روز سے انہوں نے لاہور میں آمد و رفت اور لکھنے پڑھنے کا ہلکا کام شروع کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک ان کی صحت اس حد تک بحال نہیں ہو سکی کہ وہ اشارات رقم کر سکتے۔

میں نے عجلت و مشغولیت کے عالم میں اس مرتبہ بہرۂ اشارات کے اس اچانک پیدا شدہ خلا کو اپنی تحریر سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی ایام میں حکومت کی مقرر کردہ ایک کمیٹی برائے نسوانی حقوق کی رپورٹ پریس میں شائع ہوئی ہے جس کی بعض سفارشات بے حد محلِ نظر اور انتہائی غور و فکر کی محتاج ہیں۔ میں نے انہی کے ایک جزو پر اپنا تبصرہ و تجزیہ پیش کیا ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ محترم صدیقی صاحب کے حق میں صمیمِ قلب سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کامل صحت و توانائی عطا فرمائے۔ تاکہ وہ بدستور اور تادیر اپنے قلم کو خدمتِ دین کے لیے رواں رکھیں اور ہم ان کی نگارشات سے مستفید ہوتے رہیں۔ آمین)

غلام علی

وزیر اعظم پاکستان نے جنوری ۷۶ء میں اٹارنی جنرل پاکستان کے زیر صدارت پاکستانی خواتین کے حقوق معین و مرتب کرنے کے لیے ۱۳ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر فرمائی تھی۔ اس کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ کا ایک حصہ ۱۹ اور ۲۰ جولائی کے اخبارات میں شائع ہوا ہے جس کا مقصد اس پر ملک کی رائے عام اور ردّعمل معلوم کرنا ہے۔ محترم صدر کمیٹی نے کراچی میں رپورٹ کو پریس کے حوالے کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ حکومت یا کمیٹی ہرگز ایسا کوئی قانون تجویز یا نافذ نہیں کرے گی جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہو۔ تاہم بعض پہلوؤں میں اختلاف ممکن ہے اور ان کے بارے میں ہمارا دل کھلا ہے۔ ان کا یہ اعلان ہمارے لیے یک گونہ موجبِ اطمینان ہے اور ہم اس رپورٹ کے متعلق اپنی گزارشات پیش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ان پر کھلے دل سے اور قلب و نظر کی وسعت کے ساتھ غور کیا جائے گا، اور ان میں اگر رپورٹ کے کسی جزء سے اظہار اختلاف ہوگا یا کسی غلطی کی نشان دہی کی جائے گی تو اسے نظر انداز کرنے یا ناگواری محسوس کرنے کے بجائے اس سے استفادہ کیا جائے گا۔

اس حقیقت سے تو انکار ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک مدتِ دراز سے چونکہ ہمارے ہاں اسلامی قوانین معطّل اور اسلام کا عادلانہ اجتماعی نظام منہدم ہو چکا ہے، اس لیے مسلمان معاشرے کا ہر فرد اور ہر طبقہ بے چینی اور اضطراب کا شکار اور اصلاحِ حال کا محتاج ہے۔ لیکن اوّلین اور بنیادی سوال جو اس ضمن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہم اپنے امراض کا مداوا، اپنی مشکلات کا ازالہ اور اپنی تعمیرِ نو کا آغاز اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں یا جدید مغربی تہذیب و تمدّن کے نظریات و عملیات کو اپنا رہنما بنانا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً یہی ہے کہ ہمارا ہر اصلاحی و تعمیری قدم اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق اٹھنا چاہیے اور خود جناب اٹارنی جنرل کا ارشاد بھی یہی ہے کہ کوئی سفارش یا قانون سازی قرآن و سنت کے خلاف نہ ہوگی۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی چیز کے قرآن و سنّت کے مطابق یا مخالف ہونے کا صحیح اور بہتر فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو قرآن و سنت کا علم رکھتا ہو یا جسے ایسا علم رکھنے والے کا مشورہ و تعاون حاصل ہو۔ حقوقِ خواتین کی تعیین کرنے والی اس معزز کمیٹی کے ارکان کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ بیگم نسیم جہاں - ایم - این اے
۲۔ بیگم ریحانہ سرور، ایم - پی - اے -
۳۔ بیگم سمیعہ عثمان سابق سینیٹر
۴۔ بیگم رشیدہ پٹیل کونسل حکومت پاکستان -

۵ - بیگم نسیم سلطانہ ایڈووکیٹ - ۶ - مس فاضلہ علیانی ، ایم ـ پی ـ اے -
۷ - مسٹر ڈی ـ ایم ـ اعوان ایڈووکیٹ جنرل پنجاب - ۸ - مسٹر غلام علی میمن ایڈووکیٹ جنرل سندھ -
۹ - مفتی محمد ادریس ایڈووکیٹ جنرل سرحد - ۱۰ - بیگم زری سرفراز ، مردان -
۱۱ - مسٹر محمد حیات جنیجو ایڈووکیٹ کراچی - ۱۲ - مسز مریم حبیب ایڈیٹر شعبہ خواتین پاکستان ٹائمز -
۱۳ - مسز میرا فیلبس ، پرنسپل کینیرڈ کالج ، لاہور -
ڈاکٹر مسز پروین شوکت علی ، محکمہ تعلیم پنجاب اور مسز سی ـ اے ـ رحمٰن بھٹی اور جی ـ ایس گھنگرو سکرٹری و ڈپٹی سکرٹری لا ڈویژن کمیٹی کے ممبر اور سکرٹری ہیں -

---

ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس پورے زمرۂ ارکان میں سے کتنے صاحبان یا صاحبات ایسی ہیں جو قرآن وسنت کا برائے نام علم ہی رکھتی ہوں ؟ کتاب وسنت کے ضروری علم سے بہرہ مند نہ ہونے کے باوجود اجتہاد کا منصب سنبھال لینے اور مسلم لا کی تشریح اور اس میں ترمیم و تنسیخ کی کوشش کرنے کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ مسلمان معاشرے کے بگاڑ اور خلفشار و انتشار میں اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو اسے بھی پورا کر دیا جائے - اسلامی قانون کا جو حصہ بالخصوص مسلمانوں کی ازدواجی و عائلی زندگی سے تعلق رکھتا ہے وہ ان کی تہذیب و تمدن کا سنگ بنیاد ہے - کوئی مسلمان فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد ، قانون کے اُس دائرے سے خارج نہیں ہے جو ازدواجی تعلقات اور حقوق و فرائض کو منضبط کرنے کے لیے بنایا گیا ہے - رشتۂ ازدواج کا نہایت گہرا اور دُور رس تعلق ایک مسلمان شوہر اور مسلمان بیوی کے دینی احساسات و معتقدات ، عصمت و عفت کے احساسات اور نسب کی حلت و حرمت کے تصورات سے ہے - کوئی حکومت یا اس کی قائم کردہ کوئی کمیٹی اگر من مانے طریق پر کسی خاص طبقے مثلاً مزدوروں ، کسانوں یا کارخانوں اور دفاتر میں کام کرنے والے ملازمین کے کچھ حقوق متعین کر دے اور ان کا قانونی نفاذ ہو جائے تو اس سے مسلمان معاشرے کی پوری اخلاقی و معاشرتی زندگی اس طرح متاثر نہیں ہو سکتی جس طرح " عورتوں کے حقوق " کی پُر فریب اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اُس دائرۂ قوانین میں رد و بدل سے ہوتی ہے جس کا تعلق نکاح ، طلاق ، خلع ، نان و نفقہ وغیرہ کے شخصی معاملات سے ہے - مسلم معاشرے کے مرد و زن کی اِس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی حیاتِ عائلیہ کے متعلق اسلام کے صریح اور واضح قوانین سے انحراف

کر کے ان پر غیر اسلامی، غیر فطری اور غیر معقول قوانین نافذ کرنے کی کوشش یا سفارش کی جائے۔

جو بات اُوپر تمہیدی اور اجمالی طور پر کہی گئی ہے، اس کی وضاحت میں اب ہم ایک ترتیب کے ساتھ کمیٹی کی چند سفارشات اور ان پر اپنا تبصرہ پیش کریں گے تاکہ ہمارا مدعا و منشا پوری طرح کمیٹی کے ارکان اور عام قارئین کے سامنے آ جائے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے آغاز میں کچھ عمومی سفارشات اور مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء میں کچھ رسمی ترمیمات دفعہ ۳۱ تک پیش کی ہیں۔ اس کے بعد دفعہ ۳۲ سے لے کر دفعہ ۴۳ تک جو سفارشات تجویز کی گئی ہیں ان کے بغور مطالعے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ان سفارشات کا نہایت واضح مقصد یہ ہے کہ اسلام نے نکاح کی گرہ کھولنے کا اختیار جس طرح مرد کو دیا ہے، اُسی طرح یہ اختیار عورت کو بھی دے دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ جس طرح مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے، اُسی طرح عورت کو بھی اپنے خاوند کو طلاق دینے کا حق دیا جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ جو عورت پانچ سال تک ایک مرد کے نکاح میں رہے، وہ قیدِ نکاح سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی سابق خاوند کی جائداد میں حصہ دار قرار پائے۔

اس کمیٹی کی دلی خواہش اور تمنا تو یہی ہے کہ عورت جب چاہے اپنے خاوند کو طلاق دے سکے اور قانون اس میں اس کی پوری مدد کرے، لیکن کمیٹی کے ارکان اپنے دل کی بات کو صاف الفاظ میں بیان نہیں کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں (یا جانتی ہیں) کہ کوئی خدا سے ڈرنے والی غیرت مند مسلم خاتون اس قانونی اجازت سے بمشکل فائدہ اُٹھانے پر رضامند ہو گی اور کوئی ادنیٰ دینی حس رکھنے والا مسلمان مرد ایسی عورت کو غیر منکوحہ یا مطلقہ سمجھ کر ہرگز اُسے اپنی زوجیت میں قبول نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس تلخ بلکہ سخت نجس و ناپاک گولی کو مسلمانوں کے حلق سے زبردستی نیچے اُتارنے کے لیے کمیٹی کے ارکان عورت کے اس مزعومہ حق طلاق کو کبھی خلع اور کبھی عدالتی تفریق و تنسیخ کے غلاف میں لپیٹنے کی ناکام سعی کر رہے ہیں اور ان کے بیان و استدلال میں عجیب تضاد اور ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

پہلے وہ دفعہ ۳۳ میں فرماتے ہیں:

"بیوی اگر مسلم لا کے تحت خلع حاصل کرنے کی مستحق ہو اور خاوند کو مالی معاوضہ دینے پر تیار ہو تب

بھی اُسے تفریقِ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے"۔

اس فقرے کے فوراً بعد دوسرا فقرہ یہ ہے:

"مسلم لا کے تحت جو عورت خلع کے اصول پہ تفریقِ نکاح کا مطالبہ کرے اور خاوند کو مالی معاوضہ دینے پر تیار ہو تو اُسے اپنا "حقِ تفریقِ نکاح" استعمال کرنے کے لیے عدالت یا قاضی کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے"۔

یہ دونوں باتیں اور "مسلم لا" کی یہ تعبیریں باہم متصادم و متناقض ہیں۔ البتہ ان میں کسی حد تک تطبیق کی ایک صورت سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ یوں فرض کر لیا جائے کہ پہلے فقرے میں "مسلم لا" سے مراد رائج الوقت قانون ہے اور دوسرے میں "مسلم لا" سے مراد اسلامی قانون کا وہ تصور ہے جو کمیٹی کے ارکان کے ذہن میں ہے اور جسے وہ صحیح اسلامی قانون سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ اُلجھن باقی رہتی ہے کہ رپورٹ کے مرتبین دانستہ یا نادانستہ طور پر خلع اور عدالتی تفریق کو ہر حیثیت سے بالکل ایک شے قرار دے رہے ہیں اور دونوں کو خلط ملط کر کے غلط استدلال اور غلط اعتراض وضع کر رہے ہیں۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے نہ ہر عدالتی تفریق خلع کی تعریف میں آتی ہے، نہ ہر خلع میں عدالتی کارروائی ضروری ہوتی ہے۔ فقہائے اسلام کے نزدیک خلع کی تعریف یہ ہے کہ مہر یا اس سے کم و بیش مالی بدل کے عوض میں خاوند لفظ "خلع" یا اس کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ نکاح کو زائل کر دے اور عورت اِس ازالۂ نکاح بالمال کی پیش کش کو قبول کر لے۔ خلع میں عدالت سے رجوع ضروری نہیں، صرف مال کے بدلے میں عورت کی طرف سے قبولیت شرط ہے۔ اگر زوجین باہمی رضامندی سے خلع کر لیں تو قانونِ شریعت یا رائج الوقت قانون، دونوں میں سے کوئی ایک بھی ان کی راہ میں حائل نہیں۔ خاوند اگر خلع یا طلاق پہ آمادہ نہ ہو اور بیوی خاتمۂ نکاح پہ مصر ہو، تب وہ عدالت سے تنسیخ و تفریق کا فیصلہ حاصل کرے گی اور ایسی صورت میں بھی قانونِ شریعت یا مُروّج قانون اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ مرد اگر طلاق یا خلع کے ذریعے سے نکاح کو زائل نہ کرے تو عورت کے لیے قانوناً یا شرعاً عدالت سے رجوع ناگزیر ہے۔ لیکن کمیٹی کے ارکان کا کہنا یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عدالت یا قاضی کے سامنے جانا ضروری نہیں ہے۔ اپنے اس دعوے کے حق میں وہ امام شعرانی کی المیزان الکبریٰ کی درج ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:

"ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر بیوی شوہر کو ناپسند کرے تو وہ مالی بدل ادا کر کے خلع حاصل کر سکتی ہے"۔

اس وقت امام شعرانی کی یہ کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن بالفرض اگر انہوں نے ایسا لکھا ہے تو اس سے مراد وہ صورت ہے جبکہ باہمی مفاہمت کے نتیجے میں خاوند خلع پر تیار ہو۔ اس کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ خاوند کی عدم آمادگی میں بھی عدالت سے تنسیخ نکاح کرانا ضروری نہیں اور عورت جس خاوند کو ناپسند کرے اُسے خود ہی فارغ خطی کی رسید دے اور جہاں جی چاہے چلی جائے۔

اس کے بعد رپورٹ میں سورۂ بقرہ آیت ۲۲۹ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آیت یہ ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔

(اور تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم ان عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو، اِلّا یہ کہ دونوں کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا خوف ہو۔ پس اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ معاوضہ دے کر علٰحدگی اختیار کرے)۔

اس آیت سے بھی عدالتی کارروائی کی قطعی نفی یا عدم لزوم کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ آیت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان گھر کے گھر ہی میں کوئی بات طے ہو جائے تو جو مالی معاوضہ طے ہوگا، وہی نافذ ہوگا۔ لیکن معاملہ عدالت میں جائے تو عدالت اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع عورت مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا اور حدود اللہ کی پامالی کا خدشہ ہے تو عدالت کو اختیار ہے کہ جو فدیہ یا معاوضہ چاہے تجویز کرے اور خاوند سے خلع دلوائے یا تنسیخ نکاح کا فیصلہ کردے۔ عجیب بات ہے کہ کمیٹی اس آیت سے عدالتی کارروائی کا غیر ضروری ہونا ثابت کرنا چاہتی ہے حالانکہ اس میں تمہیں کا خطاب زوجین کے ماسوا ایک فریق ثالث سے ہے جو عدالت سے رجوع کا ایک واضح قرینہ ہے۔ خود عبداللہ یوسف علی کا جو ترجمہ رپورٹ میں نقل ہوا ہے اس میں بھی تم سے مراد قوسین میں قاضی لیا گیا ہے۔ ...... If ye (judges) do fear۔ اس کے بعد بھی حیرت ہے کہ اس آیت کو من گھڑت معنی پہنائے جا رہے ہیں اور تفریق نکاح کے لیے قضائے قاضی کو غیر ضروری قرار دے کر عورت کو ازالۂ نکاح کا یک طرفہ حق بخشا جا رہا ہے۔

اِس آیت کے بعد رپورٹ میں حضرت ثابتؓ بن قیس کا واقعہ حدیث سے نقل کیا گیا ہے لیکن اس حدیث سے بھی وہ بات ثابت نہیں ہوسکتی جو رپورٹ تیار کرنے والوں کے پیشِ نظر ہے کیونکہ اس حدیث کے آخری الفاظ جو رپورٹ میں بھی موجود ہیں، یہ ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابتؓ سے کہا کہ اپنا باغ واپس لے لو اور عورت کو طلاق دے کر قیدِ نکاح سے آزاد کر دو۔ چنانچہ ثابت نے ایسا ہی کیا۔"

اس حدیث سے تو اُلٹا اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ نکاح کی گرہ خاوند ہی کے ہاتھ میں ہے اور عدالت پہلے خاوند کو طلاق یا خلع کا حکم دے گی اور چاہے تو مالی معاوضہ بھی طے کرے گی۔ اگر خاوند مان جائے تو فبہا ورنہ عدالت نکاح کو کالعدم کرے گی۔ اس سے یہ مطلب کب نکلا کہ عورت نکاح کا خاتمہ خود کر دے گی اور عدالت کا کام فقط اس پر مہر توثیق لگانا اور مالی بدل طے کرنا ہے۔

یہ مختصر بحث ہی اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اس ایک آیت قرآنی، ایک حدیث اور ایک فقہی قول سے جو استنباط و استدلال کمیٹی کے ارکان نے کیا ہے وہ کہاں تک روا اور درست ہے اور اس کے بعد دفعہ ۳۵ میں بیان کردہ یہ دعویٰ کس حد تک حق بجانب ہے کہ:

"کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسلم خاتون کو یہ ثابت کرنے کے لیے عدالت کے سامنے جانے پر مجبور کیا جائے کہ وہ اور اس کا خاوند حدود اللہ کو قائم رکھتے ہوئے باہم نباہ نہیں کر سکتے اور مالی بدل کے عوض میں تنسیخ نکاح کا فیصلہ عدالت کو صادر کرنا چاہیے۔ مسلم لا کے تحت عورت خلع کے ذریعے سے خاوند سے علیٰحدگی حاصل کر سکتی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس حق کو قانوناً تسلیم کیا جائے۔"

ہم اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ یہ خواہ مخواہ کا خلطِ مبحث ہے جو عورت کو نام نہاد حقِ طلاق عطا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ باہمی افہام و تفہیم اور سمجھوتے کے ذریعے سے اگر خاوند طلاق یا خلع بالمال پر راضی ہو جائے تو عدالتی چارہ جوئی کے بغیر بھی خاتمہ نکاح ہوسکتا ہے، بلکہ اسلام اسی بات کو پسند کرتا ہے کہ گھریلو زندگی کے گندے چیتھڑے عدالت میں نہ دھوئے جائیں تو بہتر ہے۔ مگر اِس حق کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کا وقت اب نہیں آیا بلکہ یہ حق چودہ سو سال سے قانوناً و شرعاً مسلّم ہے کہ طلاق یا خلع یا ازالۂ نکاح کے لیے یا مال کی مقدار معین کرنے کے لیے (باقی بر صفحہ ۶۴)

(بقیہ اشارات) لازماً عدالت سے رجوع کی حاجت نہیں۔ فریقین چاہیں تو آپس کی مفاہمت و مصالحت سے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ خاوند اگر طلاق یا خلع دینے پر تیار نہ ہو تب بھی عدالت سے تفریق نکاح کی ڈگری لیے بغیر بیوی اپنے آپ کو یا اپنے خاوند کو طلاق دے کر بندشِ نکاح سے آزاد ہو سکتی ہے، یہ ایک ایسی لغو اور بے بنیاد بات ہے جس کے حق میں قرآن، حدیث، یا فقہ کے ذخیرے میں ذرہ برابر بھی کوئی دلیل و ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر کمیٹی کے ارکان کو اسی غلط اور غیر اسلامی موقف پر برابر اصرار ہے۔ چنانچہ دفعہ ۳۵ کے آخر میں پھر یہ کہا گیا ہے:

"کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ فیملی لاز آرڈی ننس کی دفعہ ۸ میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ جب بیوی بذریعہ خلع اپنے خاوند سے رہائی کی خواہش مند ہو تو وہ چیئرمین کو (یا عائلی عدالت کے صدر کو) نوٹس دے دے کہ وہ خاوند کو ادا ہونے والے مالی معاوضہ کی مقدار مقرر کر دے۔ چیئرمین اس معاوضے کے تعین کے بعد دفعہ ۷ کے تحت مصالحتی کارروائی کا آغاز کر دے گا اور مصالحت کی ناکامی کی صورت میں عورت کے نوٹس یا وضع حمل کے نوے دن بعد نکاح زائل اور کالعدم قرار پائے گا۔"

یہاں "بذریعہ خلع" کے الفاظ کا استعمال محض تکلفاً کیا گیا ہے، یا پھر ان سے غرض مغالطہ آفرینی ہے، ورنہ کمیٹی کا اصل مدعا یہ ہے کہ بیوی جب چاہے اپنے خاوند پر طلاق وارد کر دے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر خاوند کچھ مال بھی وصول کرنا چاہے تو اس کی وصولی خاوند کی مجرد خواہش کے بل پر نہیں ہو سکتی بلکہ اس معاملے میں عدالت کو استعمال کیا جائے گا۔ چنانچہ عدالت یہ خدمت انجام دے گی اور اس کے بعد پھر مصالحتی کارروائی شروع کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ اب تک آپ اس پر زور دے رہے ہیں کہ خلع کے لیے کسی عدالتی کارروائی کی حاجت نہیں، تو پھر اگر یہ آپ کے بقول "رہائی بذریعہ خلع" ہے تو اس میں یہ عدالتی اور مصالحتی کارروائی کہاں سے نکل آئی۔ طلاق کے بعد، اگر وہ رجعی ہو، تو رجوع کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن خلع اور عدالتی تفریق تو طلاق بائن کا اثر رکھتی ہے جس کے بعد کسی مصالحت اور رجوع کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، پھر یہ کیسی مصالحتی کارروائی اور اس کی ناکامی یا کامیابی ہے جس کا ذکر آپ فرما رہے ہیں۔ آپ اپنے دل کی بات کو صاف صاف زبان پر لائیے اور سیدھی طرح کھل کر کہیے کہ بیوی جب چاہے اپنے خاوند کو طلاق رسید کر سکتی ہے۔ لیکن خاوند اگر طلاق کے ساتھ کسی مالی معاوضے کا مطالبہ کرتا ہے، تو اس معاوضے کی تعیین

عدالت کے ذریعے سے ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ رپورٹ کی اس دفعہ ۳۵ میں عورت کو یک طرفہ ازالۂ نکاح کا جو حق دیا جا رہا ہے اس کا اسلام کے تجویز کردہ طریق خلع سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا دھوکا اور مغالطہ ہے جو خدا کے دین اور اس کے پیروؤں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ چالبازی انشاء اللہ ناکام ہوگی — چونکہ رپورٹ میں قرآن وسنت اور اجماعِ فقہاء کا ذکر موجود ہے، اس لیے دل میں یہ خیال بھی آرہا ہے کہ شاید کچھ پردہ نشین علماء وفضلاء ایسے ہوں جو شریک مشورہ رہے ہوں مگر ان کے نام ظاہر نہ کیے گئے ہوں۔ اگر یہ گمان غلط ہے تو اللہ ہمیں معاف فرمائے اور اگر صحیح ہے تو ان حضرات کے اسمائے گرامی پردۂ خفا میں نہیں رہنے چاہییں تاکہ پوری قوم اس رپورٹ کے مصنفین سے آگاہ ہو اور انہیں پہچان لے۔

اس سلسلے میں ایک بات کا مزید ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت نے خود اپنے دامنِ عاطفت میں ایک ادارہ، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے نام سے قائم کر رکھا ہے — ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن پی، ایچ۔ ڈی مستقلاً اس ادارے سے "بحیثیت مشیر قانون" وابستہ ہیں اور وہ مجموعۂ قوانینِ اسلام کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر رہے ہیں جس کی پانچ جلدیں اب تک یہی ادارہ چھاپ چکا ہے۔ اس کتاب کی جلد دوم میں طلاق، خلع، تفریق وغیرہ عائلی مسائل پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ خلع ومُبارات کی بحث صفحہ ۵۰۰ سے لے کر صفحہ ۶۰۹ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اگر اس رپورٹ کے ارکان، بالخصوص کمیٹی کے فاضل صدر کا اطمینان ہماری گذارشات سے نہ ہو تو انہیں چاہیے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ شاید اس طرح انہیں اپنے غلط موقف کا احساس ہو اور وہ اس پر جمے رہنے کے بجائے حق کی جانب رجوع کر سکیں۔

سردست ہم اس کتاب کا ایک اقتباس یہاں نقل کیے دیتے ہیں جو اس کے صفحہ ۵۹۲ پر "خلع اور حکم عدالت" کے زیر عنوان درج ہے اور وہ یہ ہے:

"امام بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلع کو جائز کیا ہے اگرچہ وہ سلطان کے سامنے نہ ہو۔ عام علماء کے نزدیک بھی خلع کے جائز ہونے کے لیے سلطان (حاکم وقت) کا موجود ہونا شرط نہیں۔ امام کاسانی نے بھی اسی نظریہ کو صحیح لکھا ہے۔ احناف، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی

قول ہے۔ قاضی شریح، زہری اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ ابن قدامہ مقدسی نے اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ چونکہ خلع عقدِ معاوضہ ہے لہٰذا جس طرح نکاح اور قطع عقد باہمی رضامندی سے ہوتا ہے اور جس طرح ایسے دوسرے عقود میں حاکم کی موجودگی شرط نہیں ہے، اسی طرح خلع میں بھی شرط نہیں ہے۔

لیکن فقہاء کے نزدیک خلع کے لیے حاکمِ وقت کی موجودگی ضروری نہ ہونے کا صرف یہ مطلب لیا جائے گا کہ فریقین باہمی خلع کرنا چاہیں تو اس کے جواز کے لیے حکمِ حاکم یا قاضی کی شرط نہیں۔ چنانچہ اگر فریقین باہمی رضامندی سے علٰحدگی اختیار کرنا چاہیں تو اس کو فقہی اصطلاح میں مبارات کہا گیا ہے جو خلع کے حکم میں ہے۔ لیکن اگر فریقین میں ناچاقی ہو تو اس کا فیصلہ کرو وہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور خلع کرنا چاہیے، یہ کوئی تیسرا شخص ہی کر سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں خلع عدالت کے ذریعے کرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر عورت رشتۂ زوجیت کو منقطع کرنا چاہے اور مرد کو اس کا بدل دینے کے لیے آمادہ ہو تو اسلام مذکورہ شرائط کے ساتھ عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکمِ وقت یا اس کی قائم کردہ عدالت میں حاضر ہو کر استغاثہ پیش کرے اور بذریعہ عدالت شوہر سے خلع حاصل کرے۔ قرآن کی آیت: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ اور ثابت بن قیس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دینا کہ تم اپنا باغ (یا دو باغ) واپس لے لو اور زوجہ کو طلاق دے دو، اس امر کا بیّن کا ثبوت ہے کہ زوجین میں ناچاقی کی صورت میں عورت کی درخواست پر خلع کرانا عدالت کا فرض ہے جبکہ وہ اس پر مطمئن ہو جائے کہ فریقین کے لیے باہمی معاشرت میں احکامِ خداوندی کی پابندی کرنا ممکن نہیں ہے۔ ثابت بن قیس کے معاملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یقیناً اسلام کے سب سے پہلے قاضی کی حیثیت سے تھا"۔

اپنی سابق تحریر و تنقید لکھتے وقت ہمارے سامنے ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ عبارت نہیں تھی لیکن اب اسے پڑھ کر بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی اور ہماری بات میں کتنا توارُد و تطابق ہے اور خلع کے پردے میں عقدۂ نکاح کو حل یا قطع کرنے کا جو اختیار یہ کمیٹی عورت کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے وہ کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی نگاہ میں کتنا غیر مشروع اور بے جواز ہے۔ ہاں البتہ اہل مغرب کی کورانہ تقلید میں اگر مرد و زن کو طلاق کے معاملہ میں مساوات عطا کرنا مقصود ہے اور عدالت کا کام فقط یہ ہے کہ وہ مرد یا عورت کی طرف سے دی گئی طلاق کا بس اعلان و استقرار کر دے اور زوجین کے مالی واجبات کی جمع و تفریق کا حساب کر دے تو یہ بات بالکل دوسری ہے۔ (باقی)